

دھن مے کاؤس جی

ماحولیاتی خبر کو ہمیشہ اندرونی صفحات پر ڈال دیا جاتا ہے

ماحولیات کوئی وقتی فیشن یا محض ایک مغربی تصور نہیں ہے بلکہ ماحول کا غرمت اور عوام کی روزی کے ساتھ براہ راست تعلق ہے

قائل کرنا ہو گا کہ ماحولیات کوئی وقتی فیشن یا محض ایک مغربی تصور نہیں ہے بلکہ ماحول کا غرمت اور عوام کی روزی کی تعلق ہے اور یہ کہ کس طرح ماحولیا تی انحطاط کا اثر عوام پر پڑتا ہے۔ پورا میڈیا ایسا نہیں ہے۔ کئی اچھے صحافی ہیں جو ماحولیات کی رپورٹنگ کر رہے ہیں لیکن ان میں بھی یہ عزم نہیں ہے کہ اس خبر کو صفحہ اول پر جگہ دلانی چاہئے۔ چنانچہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ اس خبر کو کانٹ چھانٹ کر اندرونی صفحات پر ڈال دیا جاتا ہے۔

شروع میں ماحولیا تی تحریک کا نقطہ نظر بہت محدود ہوا کرتا تھا مثلاً افریقی ہاتھی یا بنگال ٹائیگر کی نسل کو معدوم ہونے سے بچایا جائے۔ لیکن اب یہ نقطہ نظر بدل گیا ہے اور اس بات کو محسوس کر لیا گیا کہ ان جانوروں کو اس ماحول سے الگ نہیں کیا جاسکتا جس میں وہ رہتے ہیں۔ بالکل اسی طرح چھوٹے انسانوں کو اس ماحول سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا جس میں وہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ تحریک حفاظت سے تحفظ ماحول تک جا بچی۔ لیکن اس سوچ میں

نظر ڈالیں اور آج کی سرخیاں دیکھیں تو آپ آج اور گزشتہ اکل کی خبروں یا ان لوگوں میں امتیاز نہیں کر سکیں گے جنہوں نے یہ باتیں کیں۔ یہ ایک ایسی ذہنی کیفیت ہے جسے ہم تبدیل کرنے میں ناکام رہے ہیں کہ صرف سیاست ہی خبر ہے اور دوسرا کوئی مسئلہ اہم خبر نہیں بن سکتا۔ ہمیں ان لوگوں کو جو یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ کیا چھپے، براؤ کاسٹ یا ٹیلی کاسٹ ہو

سکیں۔ آج ۱۹۹۸ء میں ماحولیا تی کوریج پیش سے زیادہ ہے، لیکن کتنی مرتبہ ماحول کو سب سے اہم خبر بنایا گیا ہے؟ بہت کم، کیونکہ ایڈیٹرز اور سب ایڈیٹرز سیاست کو سب سے اہم خبر سمجھتے ہیں اور اس سٹ کے لئے سب سے اچھے رپورٹرز مقرر کیے جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود جیسا کہ ایک ممتاز کالم نگار نے لکھا ہے کہ اگر آپ گزشتہ دس برسوں کی شہ سرخوں پر

میں ماحولیا تی تحریک کو متعدد چیلنج درپیش ہیں معقول قوانین

پاکستان

عمدہ آمد کی مشینری اور سیاسی عزم کا فقدان، لیکن ان میں سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ عوام نہ تو ان مسائل کو سمجھتے ہیں اور نہ ان کے لئے عوامی حمایت ہے اور ہمیں سے ذرائع ابلاغ کا کردار شروع ہوتا ہے، میڈیا کے لئے چیلنج یہ ہے کہ وہ ایک ایسے ملک میں ماحول کے لئے شعور اور حمایت پیدا کرے جہاں عوام کی اکثریت صاف پانی، غذا اور سرچھپانے کی جگہ جیسے فوری مسائل سے دوچار ہیں اور انہیں ماحول اور خود ان کی اپنی زندگیوں اور روزگار کے درمیان گرے تعلق کو واضح طور پر دکھائے۔

لیکن ایسا کرنے کے لئے خود میڈیا کو ماحولیا تی خبروں کی اہمیت کا قائل ہونا پڑے گا۔ خود میڈیا میں راستے عام بنانے والوں کی حمایت حاصل کرنا ہوگی تاکہ ماحولیا تی خبریں صفحہ اول پر جگہ پاسکیں یا ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی شہ سرخی بن



شہری

بی 200 ک-2 بی ای سی انڈیا
کراچی پاکستان
ٹیلی فون / فیکس 92-21-453-0646

E-mail address: shehri
@onkhura.com
(web site) URL: http://www.
onkhura.com/shehri

ایڈیٹر : انیس ہارون

انتظامی کمیٹی

چیئرمین : قاضی قاضی

وائس چیئرمین : ڈاکٹر بی بی سوزا

جنرل سیکرٹری : امیر علی بھائی

خزانچی : خلیب ام

ارکان : لوید حسین، خلیب ام

طیف حار

شہری اشاف

کو آرڈی نیٹر : سزمنور

اسسٹنٹ کو آرڈی نیٹر: محمد سعید اشرف

شہری ذیلی کمیٹیاں

آلودگی کے خلاف : لوید حسین

تحفظ درخت : دانش آرزو، ذیلی میڈیا

میڈیا اور بیرونی روابط : حیدر الرحمن، حسین

جعفری، فرمان اور

قانون : قاضی قاضی، امیر علی بھائی

رویلڈ ای سوزا، کوآرڈینیٹر سوزا، خلیب ام

پارکس اور تفریح : خلیب ام

اسلحہ سے پاک معاشرہ: لوید حسین

قاضی قاضی

مالی حصول : تمام ارکان

ذیلی کمیٹیوں کی برکنیت شہری رائے کے مطابق

تمام ارکان کے لئے عملی ہے۔ اس اشاعت میں

شامل مضامین کو شہری کے حوالے کے ساتھ شائع

کرنے کی اجازت ہے۔

ایڈیٹر/ادارتی عملہ کا خیال ہے شائع ہونے والے

مضامین سے متعلق ہوا ضروری نہیں۔

لے آؤٹ اور ڈیزائن : ذیلی ادارہ

پروڈکشن : انٹریس کیو نیٹیشن

مالی تعاون : فریڈرک ٹوان، طاہرہ

IUCN رکن

دی ورلڈ کنزرویشن یونین

آمنہ اعظم علی 1955-93



آمنہ کا پہلا ٹھکانہ "ہیرالڈ" تھا، جہاں ان کی کوششوں سے "ہیرالڈ" پاکستان کا پہلا جریدہ بن گیا جس میں ماحولیات کے بارے میں علیحدہ سیکشن ہوتا ہے۔ وہ ریسرچ رپورٹنگ میں مہارت رکھتی تھیں۔ انہوں نے سوات اور مالاکنڈ کے علاقے میں جنگلات کی کٹائی کے موضوع پر بہت کام کیا تھا۔ شہری ترقیات کی رپورٹنگ میں بھی وہ "پانیہیو" تھیں۔ "لائسنز ایئر پرائیویٹ" کے سلسلے میں ان کے کام کی بہت تعریف کی گئی تھی۔ انیس اپنے مضمون "APOCALYPSE NOW" پر اے پی این ایس ایوارڈ بھی ملا تھا۔

۱۹۸۹ میں وہ آغاخان رورل سپورٹ پروگرام میں شامل ہو گئیں اور خواتین اور ترقیات کے موضوع پر کام کرنے لگیں۔ وہ گلگت میں "ویمن ان ڈویلپمنٹ پروگرام" پر کام کر رہی تھیں اور آخر وقت تک اسی سے وابستہ رہیں۔

ذریعے پھیلنے والی بیماریوں کا سبب ہے جس کے باعث تقریباً ۶۰ فیصد بچوں کی اموات ہوتی ہیں۔

○ تربیلہ ڈیم کی حیات کار ۱۰۰ سال سے گھٹ کر ۵۵ سال رہ گئی ہے۔ وجہ؟ اچھا پانی کے ذخیرے کا بہتر انتظام نہ ہونے کی وجہ سے مٹی کی تہہ بنتا ہے۔ اس کا ملک کی آب پاشی اور آبی بجلی کے نظام پر زبردست اثر پڑے گا اور ملک کو اس کی معاشی قیمت چکانا ہوگی۔

○ کونڈ کو زیر زمین پانی فراہم کیا جاتا ہے لیکن زیر زمین پانی صبح ہونے کی رفتار سے کہیں زیادہ تیزی سے پانی نکالا جا رہا ہے، آئندہ پانچ دس برسوں میں یہ پانی بھی ختم ہو جائے گا۔

یہ سب ماحولیاتی مسائل ہیں لیکن یہ ترقی، عوام اور ان کے ذرائع آمدنی پر اثر انداز ہو رہے ہیں، میڈیا کے لوگوں کو یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ ماحولیاتی مسائل کو دلپسپ بنانے کے لئے "ہیجنگ" کی ضرورت ہوتی ہے ان مسائل کا تعلق عوام اور ان کی زندگیوں سے ہے اور یہ

اراضی، شہری استعمال کے لئے ہڑپ کی جارہی ہے گویا خوراک کی پیداوار کے لئے بہترین اراضی اب استعمال میں نہیں رہی۔

○ ملک میں صنعتوں میں استعمال ہونے والے پانی یا گھریلو سیوریج کی بہت ہی معمولی سی مقدار میں ٹریٹ منٹ کیا جاتا ہے۔ یہی پانی سب سے زیادہ پانی کے



سب سے بڑی کامیابی ۱۹۸۰ء کی دہائی میں ہوئی جب عالمی تحفظ ماحول کی حکمت عملی کی اشاعت ہوئی جو کہ آئی یو سی این ورلڈ وائلڈ لائف فنڈ اور یو این ای پی کی مشترکہ دستاویز تھی اور جسم میں "پانیہیو" ترقی کی اصطلاح استعمال کی گئی یعنی اس طرح ترقی کہ قدرتی وسائل کو اس طرح استعمال کیا جائے کہ وہ آنے والی نسلیوں کو بھی دستیاب ہوں۔

تحفظ ماحول ترقی کا الٹ نہیں ہے اور یہ کہ اس کا حصول کروڑوں لوگوں کا افلاس دور کے بغیر ممکن نہیں اور اسی لئے ماحولیاتی مسائل اور معاشی بقاء کے درمیان ایک تعلق پیدا ہوا، اسی لئے تحفظ ماحول کا اپنا ایک مقام ہے لیکن اسے کم جگہ دی جاتی ہے اور زیادہ اہمیت پانیہیو ترقی کو دی جاتی ہے۔ آئیے دیکھیں ماحول اور ترقی کے درمیان کیا تعلق ہے۔

○ سمندر سے پکڑی جانے والی مچھلیوں اور خصوصاً "بھینگے" کی پیداوار کم ہو رہی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ قیمتی برآمدی آمدنی گھٹتی جا رہی ہے۔

○ صحراگری کے عمل سے پاکستان ۳۵ ملین ہیکٹر اراضی سے محروم ہو گیا ہے اب یہ زمین زراعت یا گلہ بانی کے لئے کاشتکاروں کو دستیاب نہیں ہے۔

○ لاہور کے قریب قیمتی زرعی



چھاپے گئے، دستخطی مہم شروع کی گئی اور

این جی اوز نے مقدمے دائر کئے۔

کیرتھر کا مسئلہ ایک اور وجہ سے بھی

اہم تھا۔ ہائی وے کی ری روٹنگ کا فیصلہ

اس وقت کے وزیر اعظم نے کیا تھا یہ ایک

ایسا فیصلہ تھا جو کہ اعلیٰ ترین سیاسی سطح پر کیا

گیا تھا جبکہ اس سے افراد متاثر نہیں

ہو رہے تھے وجہ یہ تھی کہ قومی پریس نے

اسے ایک مسئلے کے طور پر اٹھایا تھا۔

انگریزی، اردو اور سندھی کے بہت سے

اخبارات نے اس کے بارے میں قلم

اٹھایا تھا۔ متعدد این جی اوز نے اس کی

حمایت کی تھی۔ انہوں نے نہ صرف شعور

عامہ بیدار کیا بلکہ اس معاملے کو عدالتوں

تک لے گئیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب

نہیں کہ ہر معاملہ اتنا ہی بلند بانگ ہو بلکہ یہ

ہے کہ تنازع اور سیاسی مسائل پر کئی

جوابی قوتوں کو صف آرا ہونا پڑتا ہے۔

○ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنے کی ضرورت

ہے کہ ماحولیاتی مسائل کا جائزہ لینے کے

کیا فوائد ہیں مثلاً شمالی علاقہ جات اور

صوبہ سرحد میں آئی یو سی این کا نباتاتی

تنوع پر ایکٹ، دیہی آبادیوں کو قدرتی

وسائل کے انتظام کے منصوبے تیار کرنے

کے لئے فنی امداد مل رہی ہے جس سے خود

ان کی اپنی ترقیاتی ضروریات بھی پوری

ہو رہی ہیں۔ ان منصوبوں کو مقامی حکومت

باقی صفحہ ۳۴

ماحولیاتی رپورٹنگ کو دو طرح سے

دیکھنے کی ضرورت ہے۔ پہلی صورت میں

رپورٹرز کو مسائل کا عمومی اور اک ہونا

چاہئے اور دوسری صورت میں ایسے

صافیوں کی ضرورت ہے جنہیں اس

موضوع کا زیادہ گہرائی تک علم ہو، اگر اس

سلسلے میں شعور و آگہی ہے تو بہت سے

لوگ طرح طرح کے مسائل کے بارے

میں لکھنا شروع کر سکتے ہیں اور جوں جوں

وہ آگے بڑھیں گے اور مہارت حاصل

کرتے جائیں گے۔ پاکستان جیسے ملک میں

یہ بات بہت اہم ہے کیونکہ یہاں میڈیا میں

جو لوگ آتے ہیں ان کا پس منظر مختلف

ہوتا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ خبروں کا

تجزیہ کیا جائے، سیم اور تھور اور صحراگری

کے عمل سے زیادہ سے زیادہ اراضی ضائع

ہو رہی ہے، زراعت اور غذائی فصلیں

کاشت کرنے کے لئے زمین کم ہوتی جا رہی

ہے۔ پاکستان اور اس کی تیزی سے بڑھتی

ہوئی آبادی کے لئے اس کا کیا مطلب

ہوگا۔ غذائی بحران۔ پچھلے سال گندم کے

بحران کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ گندم

برآمد کرنے والا ہمارا ملک سے گندم درآمد

کرنے والا ملک کیسے بن گیا۔

اگر ایک مرتبہ یہ تجزیہ شروع ہو جائے

تو پھر رپورٹنگ پر اور زیادہ توجہ دینے جانے

کا امکان ہے۔ انڈس ہائی وے کی مثال

لیجئے۔ ۱۹۷۰ء کے عشرے میں اس کے

بارے میں سوچا گیا کہ کراچی کو شمالی علاقوں

سے منسلک کیا جائے۔ یہ منصوبہ ۱۹۹۱ء میں

سامنے آیا جب اس کا ایک حصہ نوری آباد

سے سیون تک کیرتھر ٹینٹل پارک سے

ہوتا ہوا تعمیر کیا جا چکا تھا عوام کے دباؤ کی

وجہ سے سڑک کے روٹ میں ترمیم کر کے

اسے پارک کی حدود کے ساتھ ساتھ تعمیر

کیا گیا۔ اس معاملے میں اخبارات نے ہی

توجہ دلائی، اخبارات نے اس معاملے کو

زندہ رکھا اور پھر کئی مہینوں بعد اس کے

بارے میں فیصلہ ہوا، اخبارات میں

اداریے لکھے گئے، ایئر کے نام خطوط

سیم اور تھور اور صحراگری

کے عمل سے

ارضی ضائع ہو رہی

ہے، زراعت اور غذائی

فصلیں

کاشت کرنے کے

لئے زمین کم ہوتی

جا رہی ہے، گندم برآمد

کرنے والا ملک گندم

درآمد کرنے والا کیسے

بن گیا

ہے خاص طور پر زراعت کے لئے۔

کیونکہ اس سے سائنس دانوں کو غذائی

فصلوں کی نئی اقسام پیدا کرنے میں بہت

مدد ملتی ہے مثلاً گندم کی ایسی اقسام جو

کیڑوں کوڑوں کے حملوں کا مقابلہ

کر سکیں اور فی ایکڑ زیادہ پیداوار دیتی

ہوں۔

○ یہ عالمی مسئلہ کیسے ہے؟ کہہ ارض

کی جدت پذیری گرین ہاؤس گیسز اور

اوزون کی تہ کی مثال لیجئے، ان کے بارے

میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن مغرب

کے نقطہ نظر سے اس بات کو بہت کم سمجھا

جاتا ہے کہ پاکستان ان مسائل سے کیسے

متاثر ہو رہا ہے۔ اگر زمین کے درجہ

حرارت میں معمولی سا بھی اضافہ ہوتا ہے

تو اس کا ایک اثر یہ ہوگا کہ شمالی علاقوں

میں برف زیادہ پگھلنے لگے گی اور اس کے

نتیجے میں پنجاب میں سیلاب آنے کے

امکانات بڑھ جائیں گے۔

بہر حال ہماری سیاسی شخصیتوں کے بیانات اور تقاریر سے کہیں زیادہ دلچسپ مواد ہے۔

اگر اس بات پر اتفاق ہو جائے کہ

ماحولیاتی رپورٹنگ ضروری ہے تو پھر اگلا

مرحلہ اس موضوع کو سمجھنا ہے۔

ماحولیات کئی علوم پر محیط ہے۔ اس کے

کچھ تصورات سائنسی نظریات ہیں جن کی

سادہ انداز میں تشریح کی ضرورت ہے اور

ان میں مقامی، قومی اور عالمی سطح کے

مسائل بھی شامل ہیں۔

○ پائیدار ترقی کی اصطلاح کے تحت

بہت سے موضوعات آتے ہیں۔ قانون

سازی سے لے کر آبادی کی شرحوں میں

متعلقہ تک۔ قانون سازی کے سلسلے میں

آپ کو ماحولیاتی قوانین مثلاً "پاکستان

ماحولیاتی تحفظ ایکٹ ۱۹۹۷ء" سے لے کر

ان قوانین تک کے بارے میں جاننے کی

ضرورت ہے جن سے جنگلات، ماہی

گیری، آب پاشی، زراعت اور کانکنی

متاثر ہوتی ہیں۔ یا بین الاقوامی کنونشنز

کے بارے میں جاننے کی ضرورت ہے یا یہ

جاننا ضروری ہے کہ شرحوں میں آبادی کی

متعلقہ کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ سیم اور

تھور کی وجہ سے چھوٹے کاشت کار اپنی

زمینوں سے جبراً بے دخل ہو جاتے

ہیں۔ آپ کو مقامی طور طریقوں کا بھی علم

ہونا چاہئے مثلاً سندھ میں زمین کی

زرفیزی کو برقرار رکھنے کے لئے ہری

(ACACIA) کے پودے لگائے جاتے

ہیں یا بلوچستان کا کاربیوں کا نظام جس کے

ذریعے پھل یا پائپ کے بغیر ۲۰، ۲۰ میل

تک پانی پہنچایا جاتا ہے اور تبخیر کے باعث

ضائع نہیں ہوتا۔

○ سائنسی اصطلاحات کی سادہ لفظوں

میں وضاحت کی ضرورت ہے مثلاً حیاتیاتی

تنوع کا مطلب یہ ہے کہ ہر زندہ مخلوق میں

ایک ایسی معلومات ہوتی ہے جو اس بات

کا تعین کرتی ہے کہ وہ کیا چیز ہے اور یہ

معلومات اس کے جراثیموں میں موجود

ہوتی ہے۔ جراثیمی تنوع بڑی اہمیت رکھتا

دینا تھا۔ سینیٹر کے دوران جو مسائل زیر بحث آئے ان کا تعلق فنی انتظامی، قانونی اور سیاسی پہلوؤں سے تھا، مختلف ایشیائی شہروں کے تجربات میں کئی باتیں یکساں پائی گئیں خصوصاً "مبئی اور کراچی کو درپیش مسائل میں بہت کچھ مشترک تھا۔

یہ بات محسوس کی گئی کہ شہری حکومتوں کو اپنے مالی اور انتظامی امور کے سلسلے میں

مرکزی کنٹرول سے جتنا زیادہ ممکن ہو آزا اور خود مختار ہونا چاہئے تاکہ ان کی کارکردگی بہتر ہو۔ شرکاء نے اس بات پر اتفاق کیا کہ شہری اداروں کے کام کو شفاف بنانے اور ان کا بوجھ تقسیم کرنے کے لئے شہری معاملات میں شہریوں کی زیادہ سے زیادہ شرکت بہتر ضروری ہے۔

تاہم شرکاء میں اس بات پر اختلاف رائے تھا کہ اس کردار کو ایک ادارے کی صورت میں ہونا چاہئے یا نہیں۔ ٹھوس نفضلے کو ٹھکانے لگانا سب سے زیادہ پریشان کن مسئلہ قرار دیا گیا اور پیشتر گروپس نے اپنے شہری اداروں کی جانب سے جس طرح اس مسئلے کو حل کیا جا رہا ہے اس پر عدم اطمینان کا اظہار کیا۔ یہ شہری حکومت کا ایک ایسا شعبہ ہے جس میں نجی شعبے اور شہریوں کو زیادہ سے زیادہ شرکت کیا جاسکتا ہے۔

نومان فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام منعقدہ سینیٹر کا مقصد مختلف

فریڈرک

ایشیائی ملکوں کے عوام کے نمائندوں میں شہری حکومت، شہری تنظیموں اور شہری سوسائٹیوں کے کردار کے بارے میں وسیع تر مفاہمت پیدا کرنا اور اپنے اپنے الگ الگ تجربات کی روشنی میں باہم تبادلہ خیال کرنا تھا۔

سینیٹر کے شرکاء پاکستان، انڈیا، نیپال اور تھائی لینڈ سے ایف این ایف کے پارٹنر گروپس میں سے چنے گئے تھے، پاکستانی وفد شہری کے فرحان انور، وکٹوریہ ڈی سوزا اور محمد نعمان سی بی ایل سی کے جمیل یوسف اور ایس ڈی پی آئی کے قیصر بنگالی پر مشتمل تھا۔

ان گروپوں کو کولمبو میونسپل کونسل اور ان گروپوں کے میزبان بنڈو کاروجیا سوریا کے ساتھ مل کر کام کرنا تھا اور اس سرگرمی میں مباحثے، مقالات اور دستاویزی فلموں کی پیشکشیں میونسپل کونسل اور اس کے مختلف منصوبوں کے دورے شامل تھے۔

اس پوری مشق کا مقصد یہ تھا کہ مختلف شہری مسائل خصوصاً "کولمبو میونسپل کونسل کے حالیہ پرائیویٹائزیشن پروگرام کے حوالے سے میز کو مشورے



ورکشاپ کے شرکاء کولمبو کے میزبان کولمبو میونسپل کونسل کے اہلکار کے ہمراہ

ایشیائی میونسپلٹیوں کی ترقی

کولمبو میں منعقدہ سیمینار

میں شہری کی شرکت



شرکاء کولمبو شہری سیاحت کے لئے تیار ہیں



ورکشاپ کے اقتصادی اجلاس کی تیاری



میٹری رہائش گاہ پر اجلاس میں ورکشاپ کے شرکاء

ایف این ایف کے ریجنل نمائندے
برائے جنوبی ایشیا ڈاکٹر امیر آدم نے
سینار کی کارروائی کی میزبانی کی جبکہ ایف
این ایف سری لنکا کی سز سیکریشیا ڈیل
گوڈا نے معاون کے فرائض انجام

ٹریفک کے انتظام اور صحت کی دیکھ بھال
کی اسکیموں میں بھی شریک کیا جا رہا ہے۔
میزبے سوریہ کی قیادت میں کولمبو
میونسپل کونسل نے کولمبو شہر میں حالات کو
بہتر بنانے کے لئے جو اقدامات کئے ہیں
سینار کے تقریباً تمام شرکاء نے اس کی
بہت تعریف کی۔

پرائیویٹائزیشن کا جو پروگرام شروع کیا ہے
اس میں ٹھوس فسطے کے بندوبست کے
نظام کی نچ کاری بھی شامل ہے جس میں
زیادہ زور کمپوسٹنگ پر دیا گیا ہے۔ (کولمبو
شہر میں ۸۳ فیصد کچرا عام طور پر بناتائی
نوعیت کا ہوتا ہے) کچرے پھینکنے کی ایک
جگہ تیار کی جا رہی ہے۔ نجی شعبہ کو شہری

پرائیویٹائزیشن کے مسئلے پر بڑی تفصیل
سے بحث ہوئی اور یہ محسوس کیا گیا کہ یہ
ایک ایسا عمل ہے جو وقت کی اہم
ضرورت ہے لیکن اس کے ساتھ عوام
کے مفادات کے تحفظ کے لئے ایک
مضبوط تنظیمی ڈھانچہ ہونا چاہئے۔
میونسپل کونسل آف کولمبو نے

شہری پارک

جیسا کہ گزشتہ نیوز لیٹر میں بتایا گیا تھا، ”شہری“ نے کے ایم سی کی ”پارک اپنائیے“ اسکیم میں حصہ لیا تھا اور ایک پارک (ایس ٹی-۱۳ بلاک
نمبر ۱۱ اسکیم نمبر ۵) کلفٹن کراچی کو ”گود“ لے لیا تھا تاکہ اسے ترقی دے کر اس کی دیکھ بھال کی جاسکے۔
شہری کے عمران جاوید اس وقت پارکوں کی ترقی کے پروگرام کی دیکھ بھال کر رہے ہیں، اس غیر ترقی یافتہ پارک میں زمین ہموار کر دی گئی ہے،
پارک کے ۷۰ فیصد علاقے کی صفائی کر دی گئی ہے، ایک بڑا مسئلہ ان سیوریج لائنوں کی وجہ سے پیدا ہوا ہے جو وہاں سے گزرتی ہیں۔ کراچی واٹر
اینڈ سیوریج بورڈ کے حکام کا کہنا ہے کہ مطلوبہ فنڈز دستیاب نہیں ہیں تاہم اس مسئلے پر قابو پانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔
شہریوں کی ایک کمیٹی جو پارک کے قرب و جوار میں رہنے والوں پر مشتمل ہے ترقیاتی کام کی نگرانی اور مانیٹرنگ کے لئے مقرر کر دی گئی ہے۔
کوئی شخص، تنظیم یا ملٹی نیشنل کمیٹی جو ہمارے بچوں کے لئے تفریحی ساز و سامان، جھولے، بینچوں وغیرہ کی فراہمی کے سلسلے میں مالی تعاون کرنا
چاہے ہم اس کا خیر مقدم کریں گے۔

سری لنکا میں بلدیاتی ترقی

کولمبو میونسپل کونسل میں مثبت تبدیلیوں کے فوائد

گزشتہ چند عشروں کے دوران سیاست کونسل انتظامیہ کا اہم جزو بن چکی ہے۔ اچھے تعلقات کو یقینی بنانے کے لئے بلدیاتی انتخابات سے پہلے اس بات کی کوشش کی جاتی تھی کہ چند پیشہ ور افراد کو بھی امیدواروں میں شامل کیا جائے جبکہ چلی سٹج کے سیاست دانوں کو تو آنا ہی ہوتا ہے۔ ان لوگوں کو نامزد کیا جاتا تھا جن کا اچھا شہری ریٹھڈ جو تمام امیدواروں کو اپنے اماٹوں کا اعلان نہ کرتا پڑتا تھا اس کی وجہ سے ہمارے موجودہ دور میں ہمیں کونسلز کی ایک تجربہ کار اور پیشہ ور ٹیم منتخب کرنے میں مدد ملی۔ میں نے اپنا عمدہ سنبھالنے سے پہلے ہی اپنا نائب اور جانشین منتخب کر لیا تھا اور اسے موقع دیا کہ وہ

قیادت کے ہنر اور میزگی کرسی کی گرامت سے آشنا ہو جائے۔ مختلف پارٹیوں کے درمیان باہمی جھگڑوں اور سیاسی حماد آرائی کو کم کرنے کے لئے، جس کی وجہ سے خدمت کامیاب کر جاتا ہے۔ کونسل میں اپوزیشن پارٹیوں کے پانچ ارکان کو پندرہ اسٹینڈنگ کمیٹیوں کے چیئرمینوں میں شامل کیا گیا یہ سب مل کر داخل کابینہ تشکیل دیتے ہیں۔ یہ ایک نیا تصور ہے، میری کابینہ کے ۳۳ فیصد ارکان کا تعلق اپوزیشن سے ہے۔ ایک اور مثبت قدم یہ تھا کہ ہم نے انتظامیہ کو سیاست سے پاک کر دیا، کونسلز



کولمبو کا ایک خوبصورت منظر

جدید شہر بننے کے لئے کوشاں ہے۔ اس کی آبادی تقریباً آٹھ لاکھ ہے جبکہ نصف ملین آبادی قوننگ ہے۔

اس ملک میں انتظامی ڈھانچہ سخت درجہ بند اور رواجی یورو کریٹک انداز کا تھا۔ ہم اکثر پبلک یورو کریٹسی کی خراب کارکردگی، طویل سرخ فیتے، بد مزاج افسروں، کمتر معیار کی خدمات اور رشوت اور بد عنوانیوں کی شکایات سنتے ہیں۔ ہم نے "سیاست بازی" کی وجہ سے سرکاری شعبے کی کارکردگی میں زبردست انحطاط بھی دیکھا ہے۔ میں کسی ایسے طریقے کی تلاش میں تھا جس میں اس پوری صدی کے دوران بہت کم تبدیلی آئی ہو، چنانچہ میں نے محسوس کیا کہ پبلک ایڈمنسٹریشن کے روایتی طریقے کی جگہ پبلک مینجمنٹ کے طریقے کو اپنایا جائے۔

محسوس کیا جس کا تعلق قدیم روایات سے تھا۔ چنانچہ انہوں نے قصبوں اور شہری علاقوں سے لوکل گورنمنٹ کی جدید مشینری متعارف کرائی جو بہت حد تک برطانوی طرز پر تھی۔

ترقی پذیر دنیا کے کئی دوسرے شہروں کی طرح کولمبو کو بھی ایک شہری شکل دینے میں نوآبادیاتی نظام نے ایک اہم کردار ادا کیا۔ تجارت اور علاقائی نظم و ضبط کی ضروریات پوری کرنے کے لئے شہر آباد کئے گئے۔

۱۸۶۵ء میں کولمبو میونسپل کونسل کا افتتاح ہوا۔ اس کے قیام کے ساتھ ہی نوآبادیاتی دور میں اس ملک میں عوامی عمدے کے لئے پہلے انتخابات عمل میں آئے۔ اس وقت سے اب تک سو سے زیادہ برس گزر چکے ہیں اور یہ شہر مسلسل

میں لوکل گورنمنٹ کی ترقی کا آغاز انتہائی قدیم دور میں ہوا۔ چھٹی

صدی سے قبل کے تاریخی ریکارڈ میں بھی ٹیکس، نرخوں کی وصولی، آمدنی میں حصے، آب پاشی کے لئے پانی کی فراہمی اور انتظامی ڈویژنوں کے وجود وغیرہ کے بارے میں متعدد حوالے ملتے ہیں۔

ہر گاؤں کے معاملات ایک مقامی لیڈر کنٹرول کرتا تھا، دیکی کونسلیں جو "سجان سجا" کہلاتی تھیں، کسی مرکزی اتھارٹی کے بغیر آزادانہ طور پر کام کرتی تھیں۔

ان کے علاوہ بڑی کونسلیں بھی ہوا کرتی تھیں جو "گرتا سجا" کہلاتی تھیں یہ پورے ضلع یا صوبے کے معاملات نشانی تھیں انورادھا پورہ اور پولن نروا جیسے بڑے شہروں میں جو سری لنکا کے وسطی شمالی حصے میں واقع ہیں اپنی ٹاؤن کونسل اور میز ہوا کرتے تھے۔

پریگیزی، ڈچ اور ابتدائی برطانوی حکومتوں کے دور میں جب ہم محض ان کی ایک نوآبادی ہوا کرتے تھے تو اس نظام میں زوال آیا اور ان اداروں کو مقامی طور پر تسلیم نہیں کیا جاتا تھا۔

تاہم ابتدائی برطانوی ایڈمنسٹریٹرز نے اس پرانے نظام کی اہمیت اور افادیت کو

ہمارا تصور یہ ہے کہ کولمبو ایشیا کا ایک ماڈل شہر ہو، جہاں عوام کو بہتر زندگی میسر ہو، ہمارا مشن یہ ہے کہ عوام کو

معیاری خدمات فراہم کی جائیں، مخلص ٹیم اور وسائل کو موثر طور پر بروئے کار لائے

دی سٹی آف کولمبو۔ ۲۰۰۵ء تیار کی۔ سٹی واچ کمیٹی نے شہر کی مکمل مردم شماری کے لئے کارروائی شروع کر دی ہے۔ اس منصوبے کی سخت ضرورت تھی کیونکہ آخری مردم شماری ۲۵ سال قبل ہوئی تھی۔

شہر کی ترقی کے سلسلے میں ہماری کوششوں میں بین الاقوامی برادری نے گہری دلچسپی لی ہے۔ کونسل کا انتظامی طریقہ یہ ہے کہ شہر میں معیار زندگی اور صحت کے معیار کو بہتر بنایا جائے۔ ہم شہریوں، نجی شعبے اور این جی اوز کو ایک عوام دوست شہر کی تخلیق میں شریک کرنا چاہتے ہیں اور یہ موثر قیادت، سیاسی عزم اور جسوری اور شراکتی حکومت کے ذریعے ہی ممکن ہے۔

ہمارا تصور یہ ہے کہ کولمبو ایشیا کا ایک ماڈل شہر جہاں عوام کو بہتر معیار کی زندگی میسر ہو۔ ہمارا مشن یہ ہے کہ عوام کو معیاری خدمات فراہم کی جائیں مخلص اور لگن رکھنے والی ٹیم وسائل کو موثر طور پر بروئے کار لائے۔

یہ بات بہت ضروری ہے کہ لوکل ایڈمنسٹریشن کا نظام سیاسی طاقت کے ڈھانچے کی نظر میں قابل اعتماد اور مقامی باشندوں کی نظر میں جائز اور قانونی ہو۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ لوکل گورنمنٹ ایک باقاعدہ اداراتی اور سیاسی ڈھانچہ ہو، کیونکہ بالآخر اداروں کے قیام، طریق کار اور پالیسیوں کے تعین کی ذمہ داری سیاست دانوں، افسروں اور ہر شہر کے باسیوں پر ہی عائد ہوتی ہے۔

(دیش بندو کارو جیا لوریا کولمبو کے میئر ہیں)

❖❖❖

مشورے جاری رکھتا ہے۔

شہر آبادی کا ایک اہم حصہ وہ علاقے ہیں جہاں خدمات کی فراہمی کم ہے۔ شہر کے ۳۵ فیصد رہائشی پونٹس جگیوں، کچی آبادیوں اور چھپروں پر مشتمل ہیں۔ کیونٹی ڈیولپمنٹ کونسلوں کی تشکیل کے ذریعے عوام اور کیونٹی کی شرکت کو بڑھایا گیا ہے اور فراہم کی جانے والی سولٹوں کی حفاظت میں انہیں شریک کیا گیا ہے۔ آج کونسل کی گرانٹی میں ۶۰۰ سے زائد سی ڈی سی کام کر رہی ہیں۔

اس شہر میں پہلی بار ایک "کیئر سیر" گائیڈنٹس انفارمیشن سینٹر قائم کیا گیا ہے۔ اس مرکز پر بڑی تعداد میں نوجوان اپنے مستقبل کے کیئر کے بارے میں معلومات حاصل کرنے آتے ہیں۔ اس مرکز کا قیام بھی نجی شعبے، آرگنائزیشن آف پروفیشنل ایسوسی ایشنز جیبر آف کانس اور یونیورسٹیوں کے تعاون سے ممکن ہوا ہے۔

متحدہ این جی اوز کی کارکن خواتین بوڑھے لوگوں کے لئے گھر اور شہر کا قیمتی خاندان چلانے میں پوری طرح سہمک ہیں۔ وہ باقاعدگی سے ان اداروں کا دورہ کرتی ہیں اور وہاں کے باسیوں کی محبت سے دیکھ بھال کرتی ہیں۔

آئندہ بارہ ماہ کے دوران پانچ ہزار نوجوانوں کو پیشہ ورانہ تربیت دینے کے پروگرام میں کئی این جی اوز مدد کر رہی ہیں۔

شہر کے پرانے حسن کی بحالی کے لئے انسٹی ٹیوٹ آف آرکیٹیکٹس نے رضاکارانہ طور پر ایک دستاویز "وژن فار

کردار طویل المیعاد بنیادوں پر متعلقہ خدمات کی پیشہ ورانہ ترقی، شہر کی بہتری کے لئے متعلقہ شعبوں میں عالمی معیار کی ترقیاتی سرگرمیوں کو کونسل میں بروئے کار لانے کے طریقے تجویز کرتا تھا۔ سٹی واچ کمیٹی بھی شہری رہنماؤں اور کوالیفائیڈ پیشہ ور افراد کا ایک گروپ ہے جو نیک دہندگان، خدمات اور دوسرے سرگرمیوں کے بارے میں ہم سے مسلسل صلاح

ترقی پذیر دنیا کے کئی

دوسرے شہروں

کی طرح کولمبو کو بھی

ایک شہر

کی شکل دینے میں

نوآبادیاتی نظام

نے ایک اہم کردار ادا کیا

تجارت اور علاقائی

نظم و ضبط کی

ضروریات پوری کرنے

کے لئے شہر آباد

کئے گئے

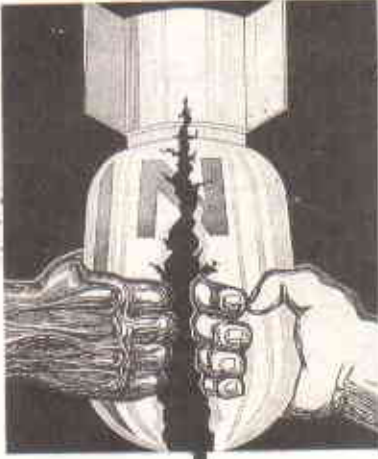
کارکردار صرف یہ رہ گیا کہ وہ اپنے رائے دہندگان کی ضروریات کے مطابق پالیسی مرتب کرائیں۔ انتظامیہ اس پر عملدرآمد کرے اگرچہ میئر کونسل کا چیف ایگزیکٹو آفیسر ہوتا ہے تاہم بہت سے اختیارات میئر کو منتقل کر دیئے گئے ہیں اور میونسپل کمشنر چیف آپریشنز آفیسر ہوتا ہے۔

زیادہ زور تربیت اور خصوصاً تعلقات عامہ اور کسٹمر فوکس پر دیا جاتا ہے۔

ان تبدیلیوں کی وجہ سے کونسل میں ایک نئی فضا پیدا ہوئی، افسروں کو یہ محسوس ہونے لگا کہ وہ ادارے کا ایک حصہ ہیں اور انتظامی شرکت کا احساس نمایاں ہونے لگا۔ سرگرمیوں میں افسروں کی زیادہ شراکت سے ٹیم اسپرٹ کا احساس پیدا ہوا مسلسل مذاکرات اور میٹنگز اور مینجمنٹ کے مثالی رویے کی وجہ سے اعتماد کی فضا اپنے علم و تجربے میں شراکت اور محنت کے ساتھ شرکت عمل، ملازمین کا خیال رکھنے اور سب سے بڑھ کر ان کو یہ یقین دلانا کہ اب کوئی سیاسی مداخلت نہیں ہوگی۔

اب نجی شعبے کو نجی خدمات کی فراہمی میں شریک کیا گیا ہے جن میں ڈپنٹریوں کی دیکھ بھال، گلیوں کے نام کی تختیاں، چوراہے، ٹریفک لائسنس سٹم، غریبوں کے لئے مشترکہ سولیات، شہر کے مستقبل کے خاکے کی تیاری، شہر کاری مہم اور تعلیمی سرگرمیاں شامل ہیں۔

مشاورتی کمیٹی کا قیام ایک نیا اقدام تھا۔ اس کے ارکان وہ لوگ مقرر کئے گئے جو اپنے متعلقہ شعبے میں مہارت، تجربہ اور شہرت رکھتے تھے۔ ان کا سب سے اہم



دھماکے کا جواب دھماکہ مزاحمت کا منگنا طریقہ

میں ڈرائیونگ کرتے ہوئے میں ایک موٹر سائیکل دیکھتا

صدر

ہوں ایک بچہ اپنے باپ کے ساتھ موٹر سائیکل پر جا رہا ہے اور وہ بچہ ایک نوذائیدہ بچے کو لئے ہوئے ہے۔ موٹر سائیکل ٹریفک میں زگ زبگ کرتی ہوئی جا رہی ہے۔ مجھے یہ ڈر لگ رہا تھا کہ وہ چھوٹا بچہ جو دس سال لڑکے کی گود میں ہے اس کے ہاتھ سے پھسل جائے گا اور ٹریفک کے جھوم میں پکلا جائے گا۔ میں گاڑی ایک طرف روک کر اس موٹر سائیکل کو اپنی نظر سے اوجھل ہونے دیتا ہوں میں صرف یہی دعا کر سکتا ہوں کہ خدا کرے میرے اندیشے غلط ثابت ہوں۔ صرف بچوں کی پرورش ہی نہیں ہم اپنی زندگیوں کے تمام پہلوؤں میں اسی قسم کی لاپرواہی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ہم ہر کام نتائج سے بے پرواہ ہو کر یونہی بے خیالی سے کرتے ہیں اور حادثات سے بال بال بچتے ہیں۔ یہی ہماری ثقافت ہے بال بال بچنا انڈیا اور پاکستان کی ثقافت ہے۔

کارس، ایئر کنڈیشننگ سسٹم، صنعتی مشینری جو ہمارے ملک میں آتی ہیں ان سب میں حفاظتی انتظامات ہوتے ہیں۔ ہم ان حفاظتی انتظامات کو نکال دیتے ہیں اور

ان چیزوں کو حفاظت پر کم سے کم توجہ دیتے ہوئے استعمال کرتے ہیں۔ اللہ ہمیں خواہ کتنا ہی احتیاط سے کام لینے کا حکم دے، ہم تو بس ہر چیز کا ذمہ دار اسی کو ٹھہراتے ہیں۔ یہ ہمارے بال بال بچنے والی ثقافت کا ایک حصہ ہے اور بعض اوقات ہم بچ نہیں پاتے عادات ہو جاتے ہیں۔ ٹرینیں پٹریوں سے اتر جاتی ہیں ہر ایک دو ماہ بعد آپ یہ سنتے ہیں کہ کوئی بس پہاڑ سے نیچے جا گری کیونکہ اس کی ضروری مرمت نہیں کرائی گئی تھی۔ یہاں سب سے عجیب نوعیت کے حادثات ہوتے ہیں۔ چند برس پہلے پوری رفتار سے چلتی ہوئی ٹرین ایک کھڑی ہوئی مال گاڑی سے جا ٹکرائی سینکڑوں افراد ہلاک ہو گئے۔ مال گاڑی وہاں اس لئے کھڑی تھی کہ ڈرائیور نے سوچا کہ آگے سفر پر جانے سے پہلے قریبی گاؤں میں ذرا اپنے لوگوں سے ہی ملتا جاؤں۔ صنعتی حادثات ہر وقت ہوتے آرہتے ہیں۔ مغربی دنیا میں بھی حادثات ہوتے ہیں لیکن وہاں بحران سے نمٹنے کے لئے سوچ سمجھ کر حفاظتی اور ہنگامی پلان پہلے سے تیار رکھے جاتے ہیں۔

اب انڈیا اور پاکستان جو بال بال بچنے والی مشترکہ ثقافت رکھتے ہیں بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ایٹمی ہتھیاروں کے مالک ہیں۔ اگر کبھی آپ یہ روداد لکھتے بیٹھ

جائیں کہ غلطی کی صورت میں کیا کیا ہو سکتا ہے تو صفحوں کے صفحے کالے ہوتے جائیں گے غلط اندازہ، غلطی، اسلحہ کا استعمال، پاگل دشمن ایٹمی سولتوں کو یہ غمائل بنائے ہوئے ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس صورت حال کو دیکھ کر تو پکے سے پکا دہریہ بھی خدا پر ایمان لے آئے گا۔ دنیا کے اس خطے میں ہم مکمل انتشار کے عالم میں زندہ رہتے ہیں اور اس افزائش کے عالم میں ہم انتہائی ملک ہتھیاروں کو اپنے کنٹرول میں رکھنا چاہتے ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ ہم اس بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والی ٹیکنالوجی کو برتنے کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

دلیل یہ دی جاتی ہے کہ اگر امریکہ، چین اور برطانیہ نیوکلیائی اسلحہ رکھ سکتے ہیں تو انڈیا اور پاکستان کے رکھنے میں کیا ہرج ہے۔ اس کا جواب واضح ہے۔ جن ملکوں کی مثال دی گئی ہے وہ معاشی اور سیاسی اعتبار سے کہیں زیادہ مضبوط ہیں۔ ہم خزانہ دہی، بی این پی، فی کس آمدنی وغیرہ کسی اعتبار سے ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے تو پھر ایٹمی اسلحہ رکھنے کے بارے میں ان کی برابری کیوں کریں پہلی بار ایٹم بم کے دو شہروں میں استعمال کے بعد سے۔ جب ایٹمی جنگ کے نتائج پوری طرح آشکار ہوئے، ان ملکوں نے انتہائی ضبط و تحمل کا

مظاہرہ کیا۔ امریکہ نے ویت نام میں ایٹمی اسلحہ استعمال نہیں کیا بلکہ بے مروت ہو کر وہاں سے لٹنا گوارا کر لیا، برطانیہ نے بھی فاک لینڈ کے مسئلے پر ارجنٹائن کے خلاف ایٹمی ہتھیار استعمال نہیں کیا جبکہ روس نے بھی افغانستان میں ایٹم بم نہیں کرایا۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر انڈیا اور پاکستان میں جنگ چھڑتی تو کیا وہ بھی اس ضبط و تحمل کا مظاہرہ کر سکیں گے؟ ہم دیوانے لوگ ہیں، ایک دوسرے سے اتنی شدید نفرت کرتے ہیں، اتنی جلدی اشتعال میں آجاتے ہیں کہ ایک گروپ اسی ملک میں رہنے والے دوسرے لوگوں کے خلاف بھی ایٹمی ہتھیار استعمال کر سکتا ہے۔

جس ملک میں جتنی خودمختاری کی شرح زیادہ ہوگی اتنی ہی بین الاقوامی طور پر اس پر زیادہ اعتماد کیا جائے گا اگر کسی ٹیکنالوجی مائیکروسیا کے پاس ہوتی تو شاید میں اتنا پریشان نہ ہوتا۔ لیکن انڈیا اور پاکستان کے غیر منظم معاشروں میں یہ ٹیکنالوجی رکھنا میرے لئے بہت تشویش کا باعث ہے۔ ان دونوں ملکوں میں خواہ کوئی بھی مستعد ادارہ ایٹمی ہتھیاروں کو کنٹرول کرے، وہ وہ عوام کی جانب سے دباؤ کا شکار رہے گا اور عوام بھی کون سے جو بال بال بچ جانے والے پلجر رکھتے ہیں۔

ماحولیاتی رپورٹنگ کو بہتر بنانے کی ضرورت ہے

انگریزی اخبارات مقامی زبانوں کے اخبارات اور جرائد کے مقابلے میں بہتر معیار کی ماحولیاتی صحافت کرتے ہیں اور متعلقہ مسائل کو زیادہ گہرائی تک جا کر سمجھتے ہیں

دور میں پاکستان خود کو ایک انتہائی ناقابل رشک صورت حال میں پاتا ہے کہ اس ملک میں خواندہ افراد سے زیادہ ناخواندہ افراد رہتے ہیں جب بھی کسی مسئلے پر مثلاً ماحولیاتی انحطاط کے بارے میں شعور عام بڑھانے کے لئے کسی مہم کا آغاز کیا جاتا ہے خصوصاً "پرنٹ میڈیا کے ذریعے" تو یہی بڑے پیمانے پر قومی ناخواندگی راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ بن جاتی ہے اس رکاوٹ کو کیسے عبور کیا جاسکتا ہے؟ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر غور کرنے کی ضرورت ہے اور اس کا تقاضا ہے کہ کوئی متبادل نئی راہ تلاش کی جائے۔ انگریزی خواص، بالائی اور متوسط طبقے اور سرکاری زبان ہے لیکن عوام اب بھی اردو اور علاقائی زبانوں میں بات چیت کرتے ہیں۔ یہ محسوس کیا گیا ہے کہ انگریزی اخبارات مقامی زبانوں کے اخبارات اور جرائد کے مقابلے میں بہتر معیار کی ماحولیاتی صحافت کرتے ہیں اور متعلقہ مسائل کو زیادہ گہرائی تک جا کر سمجھتے ہیں۔ اگر یہ پیغام دور دور تک پھیلاتا ہے تو ہمیں اس خلاء کو پر کرنا ہوگا۔

ماحول کے تحفظ سے متعلق مسائل عام طور پر سماجی، معاشی، سیاسی اور ٹیکنالوجی کے مسائل کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ ترقی یافتہ دنیا میں ماحولیاتی صحافت کو ایک خصوصی حیثیت دی جا رہی ہے اور اس کے بارے

جاتے ہیں اور اس بات کو یقینی بنانا ہے کہ وہ لوگ اس کے حل کے لئے ضروری اقدامات کریں جنہیں ماحولیاتی انحطاط کے بڑھتی ہوئی لہر کو روکنا ہے۔

دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے میڈیا ماہرین میں اس چیلنج سے عہدہ برا ہونے کی کتنی صلاحیت ہے، اس میں کیا رکاوٹیں اور مشکلات ہیں اور یہ کہ مثبت تبدیلیاں لانے کے کتنے امکانات ہیں؟ بہت سے مسائل ہیں جن کا جائزہ لینا پڑے گا۔

ترقی اور تیکنیکی ایجادات کے اس

داخل ہوں گے۔ ایک مسئلہ جس کی وجہ سے مستقبل کی ہماری خوشحالی کے خواب مہووم نظر آتے ہیں وہ ماحولیاتی انحطاط ہے۔ تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ نسبتاً ایک نیا مسئلہ ہے تاہم اب اسے اگلی صدی کا سب سے بڑا چیلنج قرار دیا جا رہا ہے۔

یہاں بھی ایک بار پھر میڈیا کو ایک اہم کردار ادا کرنا ہے عام شہریوں کے شعور کی سطح کو بلند کرنا ہے جو یا محض لاعلمی کی بناء پر یا جان بوجھ کر اس مسئلے کا ایک حصہ بن

کسی قوم کے ضمیر کی عکاسی کرتا ہے۔ الیکٹرونک پرنٹ میڈیا جو ریاست کی سازشوں سے آزاد ہو، عام آدمی کی امیدوں، انگلیوں، کامیابیوں، ناکامیوں، خوف اور اندیشوں کی آواز بن جاتا ہے۔

ہمارے جیسے ملک میں جو حکمرانی کے کبھی ختم نہ ہونے والے بحران میں پھنسا ہوا ہو جس کا اظہار سماجی، معاشی اور انتظامی انتشار اور افزائش سے ہو رہا ہو وہاں قومی میڈیا کا کردار اور ذمہ داریاں اور بڑھ جاتی ہیں۔ میڈیا کو شہریوں کو مطلع کرنا اور انہیں تعلیم دینا ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ حکومت کی غلطیوں پر بھی نظر رکھنا ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسا کردار ہے جس کے لئے ایک مضبوط قوت فیصلہ کی ضرورت ہوتی ہے اور سب سے بڑھ کر ملک اور اس کے شہریوں کی فلاح و بہبود سے غیر مشروط وفاداری اور لگن کی ضرورت ہوتی ہے۔

پاکستان ایک ایسا ملک ہے جو لاتعداد چینجوں سے دوچار ہے جس میں ہمارے اس عزم کے بارے میں سنگین شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں کہ ہم اکیسویں صدی میں ایک مالی طور پر خوشحال اور سیاسی طور پر مستحکم قوم کی حیثیت سے



میں خصوصی تربیت اور دیگر سولتیں فراہم کی جارہی ہیں۔ کیا ہم بھی ایسا ہی کر رہے ہیں یا ہم ایک دن اپنے صحافیوں کو فون لطفیہ اور شوہرنس کی کوریج کے لئے بھیجتے ہیں اور دوسرے دن وہ ایک پیچیدہ اور دھماکہ خیز ماحولیاتی مباحثے کو کور کرنے چلے جاتے ہیں۔ بد قسمتی سے یہی ہو رہا ہے۔

بعض لوگوں کو اس بات پر تشویش ہے کہ پرنٹ میڈیا تو بتدریج اپنی ماحولیاتی رپورٹنگ کو بہتر بنا رہا ہے۔ الیکٹرونک میڈیا، سرکاری کنٹرول میں ہے وہ اس معاملے میں خاصا پیچھے ہے اور اس ضمن

میں کوئی واضح پالیسی نظر نہیں آتی۔ ملک میں ناخواندگی کی شرح زیادہ ہونے کی وجہ سے پرنٹ میڈیا کا کردار مزید بڑھانے اور ابھارنے کی ضرورت ہے۔ اور کیا ہمیں یہ چینی کمات یاد دلانے کی ضرورت ہے کہ ”ایک تصویر ہزاروں الفاظ پر بھی بھاری ہوتی ہے۔“

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ماحولیاتی مسائل نوعیت کے اعتبار سے اکثر سماجی اور سیاسی مسائل ہوتے ہیں خصوصاً ”ہمارے جیسے بد عنوان سیاسی ماحول میں“ میڈیا ماہرین کو اکثر مفاد پرست لوگوں کی طرف سے سیاسی مداخلت یا مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

بعض اوقات یہ مخالفت پر تشدد بھی ہوتی ہے، پھر اس دباؤ کا مقابلہ کیسے کیا جائے۔ اکثر یہ محسوس کیا گیا ہے کہ ماحولیاتی انحطاط کے بارے میں خبریں مثلاً جنگلات کی کٹائی، پینے کے پانی کی آلودگی، کیاب جانوروں کا شکار، کچرا جلانا وغیرہ قارئین میں وہ جذبہ اور دلچسپی پیدا نہیں کرتیں جتنا کہ کسی سیاسی لیڈر کے دھماکہ خیز بیانات، ماحولیاتی خبروں کو قومی بحث و مباحثہ کی پہلی صف میں لانا ہے اور یہ کام صرف بڑے اشاعتی اداروں کے دورانہی اور جرات مند اہل پالیسی اقدامات کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ فی الوقت تو اس سلسلے میں کوئی پیش

رفت دکھائی نہیں دیتی۔

امید ہے کہ حکومت اور میڈیا ماہرین مل کر جلد از جلد موجودہ صورت حال کا جائزہ لیں گے اور ایسے رہنما خطوط طے کریں گے جن سے میڈیا ہمارے ماحول کے تحفظ کے سلسلے میں زیادہ موثر کردار ادا کرنے لگے۔

(فرحان انور شہری نئوز لیٹر (انگریزی) کے ایڈیٹر ہیں)



شہری فوٹو البم



کوڑے میں روزی کی تلاش



مستی فیلے کا لٹاس



مارکیٹ کا اختتام اور سڑک کا آٹا زکماں سے ہوتا ہے؟



کاسمو پولیشن شہر کراچی کا ایک منظر

وہ کون ہوگا جو ان کاراہنما بنے گا

عمران خان کا براؤن صاحب کہاں چلا گیا

نے افغانی طالبان کو بالاپوسا پڑھایا لکھایا اور جب وہ برسر اقتدار آئے تو عورتوں کی تعلیم بند کر دی۔ عورتوں کے ہنر مسرہ کر دیے۔ وہاں ریڈ پونٹے والوں کو کوڑے لگائے جاتے ہیں۔ یہ اسی ملا کا کمال تھا۔ اسی کا دیریا اثر ہے کہ ورکشاپ کی ایک پڑھی لکھی۔ تربیت یافتہ خاتون ملا کے رول ماڈل کو از سر نو فعال کرنے کا منصوبہ پیش کر رہی تھی۔

یہی وہ مکتبہ فکر ہے جو اسلامی ہم کایک طویل ماڈل بنا کر کراچی کے حسن اسکو اڑ پلا کھڑا کرتا ہے اور اس کے ارد گرد دلا گلا کرنے والے نوجوان خود کو نسیم حجازی کے ناولوں کے کردار میں پیش کرنے کے لئے تڑپتے ہیں۔ ان کی کم انڈینٹی میں عصر حاضر کے تقاضوں کی کوئی گنجائش نہیں۔

یہی وہ تنگ نظری ہے جو فی ایف بی آئی ڈیوریم میں پیش کئے گئے پی این سی اے ”ڈائن فیشنل“ کو ہضم نہیں کر سکتی۔ رقص ان کے نزدیک صرف وہ فعل ہے جو کونھوں پر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ فنون لطیف کے زمرے میں نہیں آتا۔ انہیں کیا معلوم بلے شاہ کون تھا۔ بلے شاہ کی کافی پر ناہید صدیقی کا فن کن بلند یوں پر تھا۔ پندرہ لڑکوں کا چھوٹا سا گروپ ہال کے چھ سات سو حاضرین پر بھاری تھا۔ حاضرین محو تھے۔ وہ محل ہو رہے تھے۔ حاضرین ادا نیگی فن کے لئے عقیدت کے جذبات سے سرشار تھے کہ ان لڑکوں کے کھوکھلے قبضے اور آواز سے ان کے ذہنوں پر کچھ کے گارہے تھے۔

کون تھے وہ۔ کس نے بھیجے تھے۔

وہ کون ہوگا جو ان کاراہنما بنے گا۔

عمران خان میٹ دی پریس کے پروگرام میں کراچی پریس کلب آئے تھے۔ ان کے ہمراہ معراج محمد خان بھی تھے۔ بقول ہمارے ایک ساتھی صحافی کے کہ عمران خان نے گزشتہ عرصے میں ایک ہی کامیابی حاصل کی ہے کہ معراج محمد خان ان سے آٹے ہیں۔ کوئی سات برس قبل معراج محمد سے ایک انقلابی قسم کے اجلاس میں لاہور میں ملاقات ہوئی تھی۔ جمہوریت بحال ہو چکی تھی۔ مارشل لاء کا دور ختم ہو گیا تھا۔ معراج محمد اپنے عزائم کا ذکر کر

باقی صفحہ ۲۲

ایک گروپ کی کنونیر نے وقت کی ذور پیچھے کی طرف کھینچنے کا پروگرام پیش کیا۔

نظروں کے سامنے بہت سے عوامی منظر گھوم گئے۔ سودا خریدتے ہوئے۔ بینک میں بجلی، گیس کا بل جمع کرواتے وقت ڈاکخانے میں خطوں پر کلک لگواتے ہوئے۔ گاڑیوں کے اسٹیرنگ وکیل پر۔ بس اسٹاپس پر۔ ایئر پورٹس کے چیک ان کاؤنٹرز پر۔ کہیں نہ کہیں۔ آپ کو ایسی عورتیں ضرور نظر آتی ہیں جن کے چہروں پر۔ حلیوں پر، بنیاد پرستی کی چادر لپٹی ہوتی ہے۔

نیپا کی ورکشاپ میں آواز آئی۔ ملا ہمارا رول ماڈل ہے ہم اس تک رسائی حاصل کریں گے۔ اس کا اپنے علاقے میں بہت اثر و رسوخ ہوتا ہے۔ ہم اسے کہیں گے کہ گھر گھر جا کر عورتوں کو ان کے حقوق کے بارے میں بتائے۔

توجہ ملا تک کیا ہوتا رہا۔

ملا کسی فرد کا نام نہیں ہے۔ یہ کسی ایک ملک یا کسی ایک مذہب میں نہیں ہوتا۔ ہر مذہب کے اپنے اپنے ملا ہوتے ہیں۔ ہر ملک کے اپنے اپنے ملا ہوتے ہیں۔ بڑی طاقتوں کے زر خرید غلام۔ جو ایٹور کا، ہولی فادر کا، یسوع مسیح کا، بھگوان کا، اللہ رسول کا نام لے کر پہلے سے پڑھے ہوئے اسباق دہراتے ہیں۔

ضیاء الحق کے دور میں سرکاری دفاتر اور تعلیمی مراکز میں احکامات آیا کرتے تھے کہ عورتیں ساڑھی نہ پہنیں عورتیں مردوں کے ساتھ بات نہ کریں۔ ان سے الگ بیٹھیں۔ نواز شریف کے موجودہ دور حکومت میں چونکہ میڈیا پالیسی کے بارے میں حکم جاری ہو چکا ہے۔ اس لئے نگاہوں کا شاید ملا کو ایک بار پھر عورتوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لئے نیا کردار پیش کیا جا رہا ہے۔ ویسے بھی ہمارے صدر پاکستان جب کبھی موقع ملتا ہے۔ ضیاء الحق کے الفاظ دہراتے ہیں کہ امت کی نجات نفاذ اسلام میں ہی ہے۔ اہل دانش اس وقت بھی یہی کہتے تھے کہ بھلا از سر نو نفاذ اسلام کی کیا ضرورت ہے۔ پاکستان مملکت اسلامی جمہوریہ تو پوسلے سے ہی ہے۔

ضیاء الحق کے نفاذ اسلام نے عورتوں کو حدود آرڈینیٹنس سے نوازا، قانون شہادت سے ان کا مرتبہ بڑھایا۔ ضیاء الحق کے ملا

شرلوٹے ہوئے یونیورسٹی روڈ کے کنارے آباد فلیٹوں میں سے ایک کی کھڑکی کے باہر ایک بورڈ پر نظر پڑی۔ متحدہ قومی موومنٹ کے قائد کی تصویر کے نیچے لکھا تھا۔ ”ہمیں منزل نہیں...“ اگلا لفظ واضح طور پر پڑھا نہ گیا۔ گاڑی کی رفتار کم کی۔ اتنے میں ذہن میں جملہ پورا ہو گیا۔ ”ہمیں منزل نہیں راستہ چاہئے“ بڑی انقلابی سوچ ہے۔ جسے راستہ مل جاتا ہے اسے منزل از خود مل جاتی ہے۔ جب راستہ ہی نہ ہوگا۔ سمت کے بارے میں علم نہ ہو چکا تو پھر منزل کیسی۔ یہ باتیں تو بعد میں سوچیں۔ سامن بورڈ کو ذرا قریب سے دیکھا تو لکھا تھا۔ ”ہمیں منزل نہیں رہنما چاہئے“ اوہ۔ کاپی ٹھیک نہیں ہے۔ رہنما تو منزل تک پہنچنے کے لئے ہی چاہئے ہوتا ہے۔ یہ نہ کہ کوکے منزل نہیں چاہئے۔

زندگی میں ہر ایک کے اپنے اپنے رہنما ہوتے ہیں۔ آئیڈیل۔ جس کی رہنمائی پر اعتبار ہوتا ہے۔ جس کی جلائی ہوئی مشطوں سے ملک کے اندھیرے دور ہوتے ہیں۔ جس کی قیادت میں معاشرے کے مسائل حل ہوتے ہیں۔ ملک کے محروم طبقوں کو حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ جسے ہم ”رول ماڈل“ کہتے ہیں۔ جو ہمیں رواداری سکھاتا ہے۔ دوسرے کی بات کو سننے کا حوصلہ دیتا ہے۔ دوسرے کے جذبات کے احترام کا سبق دیتا ہے۔ اس کی خوشی میں غل ہونے سے روکتا ہے۔ اختلاف رائے پر پھرنے سے روکتا ہے۔

نیپا میں جینرل ایٹور پر ورکشاپ کا آخری اجلاس تھا۔ اس ورکشاپ میں مختلف سرکاری محکموں کے ارکان نے شرکت کی تھی۔ پچھلے چند برسوں میں جو مثبت تبدیلی آئی ہے وہ بس اتنی سی ہے کہ اب عورتوں کے مسائل پر غیر سرکاری تنظیموں کے چچائے ہوئے شور و غل کے بعد سرکاری محکموں میں بھی عورت کی اقتصادی قوت کو مضبوط کرنے اور اس کے حقوق کے بارے میں بحث مباحثے ہونے لگے ہیں۔ اس ورکشاپ میں تربیت حاصل کرنے والوں کے تین گروپ بنے تھے۔ جنہوں نے مختلف علاقوں میں عورتوں کی تعلیم و تربیت کے لئے مختلف پروگرام پیش کئے۔ ان میں ایک یہ بھی تھا کہ کیونٹی ٹینشن کے اس دور میں کمپیوٹری ٹریننگ بہت ضروری ہے اس لئے اس ضمن میں مراکز کھولے جائیں لیکن

شہری کی سرگرمیاں

اسلحہ سے انکار، زندگی سے پیار

ریحانہ افتخار کی ایک تاشراتی تحریر



تشدد کے شعلوں کو بجھانے کے لئے اسلحہ جلانا ہوگا

بندوق مسائل کا حل نہیں ہے۔ اس کا بنیادی مقصد ہی بنی نوع انسان کو ختم کرنا ہے۔ اپنے آپ سے یہ وعدہ کریں کہ ہتھیار کا استعمال نہیں کریں گے۔ ان سے خونریزی اور تشدد و ظلم کو فروغ ملتا ہے، امن، خوشحالی اور ترقی کو نہیں۔

شاید ظلم و تشدد سے آزادی کی خواہش نے ہی چند باشعور افراد کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ عام لوگوں میں یہ آگاہی پیدا کریں کہ وہ اسلحہ سے پاک معاشرے کے قیام کے لئے اپنی سی کوششیں کریں۔ اگر تمام آدمی یہ چاہتا ہے کہ وہ ترقی کرے اور خوشحالی اس کے گھر کا منہ دیکھے تو اسے بندوق سے نہ صرف خود نفرت کرنا ہوگی بلکہ اپنے بچوں کو بھی اس لعنت سے دور رکھنا ہوگا۔

یہ باشعور افراد مختلف تنظیموں اور این جی اوز سے منسلک ہیں۔ ایک این جی او ”شہری“ ہے جو بہتر ماحول کے لئے بوی تن دہی سے مصروف ہے۔ دوسری تنظیم سٹیٹن پولیس لائڈن کمیٹی ہے یہ این جی او جرائم کے خلاف لڑ رہی ہے۔ ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان ایک جانی پہچانی تنظیم ہے جو ہر سطح پر شہریوں کے انسانی حقوق کے لئے جنگ میں مصروف ہے۔ یہ تینوں تنظیمیں بہت فعال اور بہتر ماحول، پرسکون اور انصاف پر مبنی معاشرے کے قیام کے سرگرداں ہیں۔

درمیان تصادم میں خونریزی اب نئی بات نہیں رہی۔ عدم تحفظ کے احساس نے ہر شہری کو بری طرح ہلکا رکھا ہے۔ جاگیردار و سیاست دان اپنی حفاظت کے لئے مسلح گارڈز لے کر چلتے ہیں جو آزادانہ اپنے اسلحے کی نمائش کرتے ہیں اور موقع بہ موقع اپنا زور دکھانے سے دریغ بھی نہیں کرتے حکومت کیونکہ امن و امان کی صورتحال کو کنٹرول نہیں کر سکی اس لئے اس نے پرائیویٹ گارڈز کی خدمات حاصل کرنے والوں کی حوصلہ شکنی نہیں کی۔ بلکہ اس نے پولیس کو جدید ہتھیاروں سے لیس کر دیا ہے۔ انہیں مار ڈالنے کا اختیار بھی دے دیا ہے۔ حالانکہ حکومت کو اس بات پر زور دینا چاہئے کہ پولیس کے ساتھ ساتھ عام لوگوں کو زندگی کی قدر کرنے کی آگاہی کو فروغ دے۔ یہ بات بھی ہے کہ ہم اپنے بچوں کو ابھی سے یہ تعلیم دیں گے

ہے۔ فرقوں اور لسانی گروہوں کے شہری برائے بہتر ماحول نے فریڈرک نومان فاؤنڈیشن کے تعاون سے کراچی پریس کلب میں ’اسلحہ سے پاک معاشرہ‘ کے عنوان سے ایک مذاکرہ کا اہتمام کیا جس سے ممتاز شہریوں نے خطاب کیا

ہال میں کافی
دش تھا برتنوں
کائے بچوں کے
شور کے ساتھ

ڈاننگ

ساتھ باتوں کا سلسلہ بھی جاری تھا کہ کسی نے آکر کہا ”اطلاع آئی ہے کہ ضلع وسطیٰ میں ہنگامہ ہو رہا ہے۔ کچھ لوگ مارے بھی گئے ہیں۔ میں وہی جا رہا ہوں۔“ یہ خبر سنتے ہی تقریباً ”سیسی فونوگرافرز اور رپورٹرز کھانا چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

کسی نے پوچھا ”کل تو چار لوگ مرے تھے آج کتنے افراد کی خبر ہے؟“
نوالہ میرے حلق میں انک سا گیا۔
کیا بے حسی کا عالم ہے۔ قتل و غارتگری اتنی عام ہو چکی ہے کہ اب لوگ مرنے والوں کی تعداد معلوم کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ اب تو عام لوگ یہ بھی بھولنے جا رہے ہیں کہ یہ شہر بندوق کے بغیر کتنا پرسکون تھا۔ انہیں تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ ٹی ٹی کیسی ہوتی ہے اور کلاشنکوف کیا بلا ہے؟ یہ جب بولتی ہیں تو ان کی آواز میں کیا فرق ہے؟ اس شہر کے رہنے والوں کی زندگیاں تو اب ان لوگوں کے ہاتھوں میں برنگال ہیں جو بندوق اور دیگر بارودی ہتھیاروں کی نمائش کرتے ہیں ان کا کھلے نام استعمال کرتے ہیں تشدد کی ثقافت کو فروغ حاصل ہو چکا ہے۔ اب معمولی سے اختلاف رائے پر جان لے لینا عام رویہ

بجائے کراچی پریس کلب کا انتخاب کیا۔ یوں بھی کراچی کا پریس کلب ہر قسم کی ناانصافی کے خلاف آواز اٹھانے کے لئے ملک بھر میں معروف ہے۔ لیکن یہاں عام لوگوں کی شرکت بہت زیادہ نہیں ہوتی۔ اس کے باوجود ہر وہ شخص موجود تھا جسے قتل و غارت گری سے نفرت تھی۔ شرکت کرنے والوں اور خطاب کرنے والوں کی ایک ہی بڑی خواہش تھی کہ تمام غیر قانونی ہتھیاروں کو برآمد کیا جائے اور پھر انہیں تباہ کر دیا جائے۔ اس اجتماع سے ان لوگوں نے بھی خطاب کیا جو کسی نہ کسی طرح بددق سے متاثر ہوئے یا جن کے رشتہ دار و دوست قتل یا زخمی ہوئے۔ انہوں نے ان حادثوں سے متاثر ہونے کے بعد اپنے تاثرات کا اظہار کیا اور یہ کہ ان حادثوں نے انہیں اور ان کے خاندان کو کس طرح متاثر کیا۔ قتل کرنے والے تو ایک آدمی کو مارتے ہیں لیکن انہیں اس بات کا شاید کوئی اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ وہ اس آدمی سے مسلک نہ جانے کتنے ہی لوگوں کو جذباتی ذہنی اور معاشی طور پر مار رہے ہیں۔ منظر امکانی ایک صحافی تھے ان کے چھوٹے چھوٹے بچوں نے اپنے دکھ اور اپنی محرومیوں کا ذکر کیا تو موجود افراد کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

اس اجتماع میں شریک ہر شخص کی یہ خواہش تھی کہ حکومت صورتحال کی بہتری



فائز عیسیٰ انوید حسین، قادر آر نلڈ، آئی اے رحمن اور دیگر مقررین

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر شخص محبت کا پرچار کرے زندگی کی قدر کرنا سیکھے اور دوسروں کو سکھائے، شہری نے کھڑے پانے میں کنگر مار کر ارتعاش پیدا کیا ہے

انہوں نے باہمی تعاون سے اسلحہ سے پاک ماحول کے لئے ایک مہم کا آغاز کیا ہے۔ یہ تنظیمیں کیونکہ غیر سیاسی ہیں اور تشدد پر یقین نہیں رکھتیں اس لئے انہوں نے مختلف سیاسی و مذہبی جماعتوں کا طرز عمل کر کے شہر کی مصروف ترین سڑکوں اور راہوں پر جلسہ کر کے عام لوگوں کی زندگی کو مزید پریشانی میں مبتلا کرنے کی



کم از کم یہ سب لوگ تو اسلحہ سے پاک معاشرے کی حمایت کرتے ہیں

کے لئے کچھ کرے، کچھ عملی اقدام اٹھائے جائیں، کچھ سخت قوانین بنائے جائیں، اسلحہ کی کھلے عام نمائش پر پابندی ہو، قانون نافذ کرنے والے اداروں سے منسلک افراد اپنی گولی کو کسی انسان کو مارنے کے لئے استعمال نہ کریں، ہتھیاروں کے لائسنس کے اجراء میں حد درجہ احتیاط لازمی ہے۔ صرف اسی شخص کو اسلحہ کا لائسنس جاری کیا جائے جو اس اسلحہ کے درست استعمال سے واقفیت و صلاحیت رکھتا ہو۔ ہمارے شر میں اسلحہ تیار نہیں ہوتا اس لئے غیر قانونی ہتھیاروں کی آمد روکنے کے لئے موثر اقدامات کئے جائیں۔ ایسے قوانین اور طریقوں کو اپنایا جائے کہ ہتھیار عام لوگوں تک نہ پہنچ سکیں۔ یہ بات سمجھی جاتی ہے کہ امریکہ میں قتل کی وارداتوں کی تعداد دنیا بھر میں سب سے زیادہ ہے۔ اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ وہاں اسلحہ با آسانی دستیاب ہے۔ ہم یقیناً ایسا ملک نہیں چاہیں گے۔ کرپشن کے معاملے میں ہمارے



چلو، ہم آج اسلحہ کو ختم کرنے کا آغاز کریں

معیار کے نقصان کا تذکرہ ہی کیا گیا جائے۔ اس صورتحال کا پاکستان جیسا غریب ملک کسی طرح بھی تحمل نہیں ہو سکتا۔ اب بھی بہت زیادہ وقت نہیں گزرا ہے۔ ہوش میں آکر ایک باشعور شہری کی طرح سوچنا ہوگا۔ اسلحہ سے پاک ماحول ہی ہمارے لئے ناگزیر ہے۔ کیونکہ ہماری ترقی کا انحصار ہمارے استحکام، تجارت اور تعلیم کے پھیلاؤ و فروغ پر ہے۔ اسلحہ کے

ملک کا نام اکثر سرفہرست آتا ہے۔ جرائم کی شرح میں بھی ہمیں اس کا نام سرفہرست نہ آجائے۔ لیکن امریکہ ایک امیر ملک ہے۔ وہاں آتشیں اسلحہ کے استعمال سے پیدا ہونے والے تشدد پر طبی علاج و معالجے، پیداواری اور زندگی کے معیار کے نقصان پر ۱۳ بلین ڈالر خرچ ہوئے۔ ہمارے ملک میں تو یوں بھی طبی سہولتوں کا فقدان ہے۔ پیداواری اور زندگی کے

آزادانہ استعمال کے خلاف جب تک ہر شہری آواز نہیں اٹھائے گا اس وقت تک قتل و غارتگری اور امن و امان کی خراب صورتحال کا سلسلہ جاری رہے گا۔ ہم مسلمان ہیں اور اسلام وہ مذہب ہے جس نے قتل کو ناقابل معافی جرم قرار دیا ہے۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر شخص محبت کا پرچار کرے۔ زندگی کی قدر کرنا سکھے اور دوسروں کو سکھائے۔ برداشت کرنے اور عدم تشدد کی ثقافت کو فروغ دے۔ مذکورہ این جی اوز نے ٹھہرے ہوئے پانی میں کنکر مار کر ارتعاش تو پیدا کیا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ عام لوگوں کا شعور جاگ اٹھے اور وہ بددق و ہتھیار کی سیاست اور ثقافت کے خلاف جہاد کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔ پہلا قدم تو اٹھنا ہے اور اسے اب رکنا نہیں چاہئے۔ یہ اجتماعات مسلسل ہونے چاہئیں تاکہ اسلحہ سے پاک معاشرے کی خواہش عام ہو جائے اور پھر حکومت پر دباؤ اتنا بڑھے کہ وہ اس سلسلے میں کوئی موثر اقدامات اٹھانے پر مجبور ہو جائے۔

مزاحمت کی منطق کام کرے گی۔ ہو سکتا ہے کہ اب ہم بعض بنیادی حقائق کا احساس کرنے لگیں۔ سب سے بنیادی حقیقت تو یہ ہے کہ انڈیا اور پاکستان خواہ ایک دوسرے سے کتنی ہی نفرت کریں وہ ایک دوسرے کو صفحہ ہستی سے مٹا نہیں سکتے۔ انڈیا اور پاکستان کے عوام کی اکثریت بھران کے حل کے لئے کسی جنگ کے حق میں نہیں ہے۔ اس خطے میں پائیدار امن کے قیام کی کوئی بھی قیمت بہت زیادہ نہیں ہے۔ آئیے ہم اپنے لیڈروں کو مجبور کریں کہ وہ آپس میں مل کر بیٹھیں، ہم انہیں مجبور کریں کہ وہ غربت و افلاس کا خاتمہ کریں، اپنے عوام کو بنیادی سہولتیں مہیا کریں اور سوشل خزانگی کی شرح حاصل کریں۔ ان مقاصد کی تکمیل پر ہندوستان اور پاکستان کے عوام خود اتنے روشن خیال ہو جائیں گے کہ انہیں اسلحہ کی یہ دوڑ تقعا "بے مصرف معلوم ہوگی۔"

جاتی ہے۔ میں چڑھتا ہوں، یہ سارا مسئلہ بہت الجھا ہوا اور غیر ضروری ہے۔ ایسا کیوں نہیں ہو سکتا کہ دونوں ملکوں کے لیڈر بیٹھ کر آپس میں گفت و شنید کر لیں۔ گفتگو اور تدبیر، ایسی اسلحہ خاند رکھنے سے کہیں زیادہ موثر، براہ راست اور کم خرچ ہے۔ میں اس بات کو سمجھتا ہوں کہ انسان دوستی کا یہ موقف اس خطے کے سیاسی حقائق سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتا۔ اکھڑ بھارت، دو قومی نظریہ، مسئلہ کشمیر اور دوسرے مقصد کا ہم سے قربانی کا تقاضہ کرتے ہیں۔ ہندوستانی کہتے ہیں کہ انہیں ایسی ہتھیاروں کے معاملے میں چین کی بلا دستی کا خطرہ ہے اور انہیں اپنی قوت ثابت کرنا ہے۔ پاکستان بھارت کی ایسی صلاحیت سے خطرہ محسوس کرتا ہے اور ہمارے ایسی دھماکے نے برصغیر میں طاقت کے توازن کو درست کر دیا ہے۔ لیکن دنیا کے اس خطے میں ہم خود کو یہ سمجھا کر بے وقوف نہیں بنا سکتے کہ یہاں

پریشانی کے جواب میں مجھے یہ بتایا جاتا ہے کہ طیارے کے حادثے، سڑک پر ایکسیڈنٹ اور دل کے دورے کے خطرے کے ساتھ ساتھ مجھے اس ایک اور پریشانی کے ساتھ جینا سیکھ لینا چاہئے۔ میں تھوڑی دیر کے لئے ایک دوست کے ساتھ ان تحفظات کے بارے میں تبادلہ خیال کرتا ہوں جو فوری طور پر اختیار کئے جانے چاہئیں۔ دونوں جانب کے فوجی رہنماؤں کو فوری طور پر ملاقات کرنی چاہئے اور ان اقدامات پر بات چیت کرنی چاہئے جن کے ذریعے ایسی اسلحہ بردار میزائل حادثاتی طور پر دانے جانے کے امکانات ختم ہو سکیں۔ صورت حال اس وجہ سے اور پیچیدہ ہو چالی ہے کہ دونوں ملکوں کی سرحدیں بھی ملتی ہیں، ہمیں تو اتنا وقت بھی نہیں مل سکے گا کہ آنے والی کسی مشتبہ چیز کا تحقیقی تجزیہ بھی کر سکیں۔ کسی ایک سمت سے داغی جانے والی چیز آنا، "فانا" دوسری جانب پہنچ

بقیہ ہے دھماکہ

جب میں یہاں تک تحریر کر چکا تو مجھے ایک دوست کا فون آیا، اس نے مجھے بتایا کہ انڈیا اور پاکستان دونوں نے مزید ایسی دھماکے نہ کرنے کا اعلان کیا ہے۔ یہ سن کر کتنا اطمینان ہوتا ہے، لیکن طمانیت کبھی کیا دونوں ملکوں نے اپنے ایٹمی اور میزائل بنانے والے سائنس دانوں کو برطرف کر دیا ہے؟ پردے کے پیچھے کیا ہو رہا ہے؟ اگنی اور غوری کے پروگراموں کا کیا بنا۔ میں اس پردہ پوشی کے مقابلے میں شفاف پن میں زیادہ راحت محسوس کرتا ہوں۔ دونوں ملکوں کے امن پسند لوگ اسی وقت چین کی نیند سو سکیں گے جب ایک دوسرے کے خلاف ایسی ہتھیار استعمال نہ کرنے کا معاہدہ ہو اور ایک مقررہ وقت کے اندر اندر تمام ایٹمی ہتھیار ہٹائے جائیں۔

ایسی جنگ کے بارے میں میری